فیض احمد فیض

فیض صاحب کو میں نے پہلی بار امرتسر میں دیکھا۔
ان کی نظمیں ہم امرتسر کے کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' اور'' دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے''... یہ نظمیں تو ہمیں ازبر تھیں۔ میں میٹرک کرنے کے بعد ایم اے او کالج کے گرد منڈلایا کرتا تھا۔ کبھی اکیلا، کبھی اقبال کوثر اور کبھی احمد راہی اور کبھی ظہور الحسن ڈار کے ساتھ۔ ایم اے او اسکول جہاں سے میں نے میٹرک کیا، کالج کے ساتھ ہی تھا۔ صرف بیچ میں ایک گلی تھی۔ ایم اے او کالج میں ایک مسجد بھی تھی جہاں ہمیں اسکول کی طرف سے قطار میں نماز پڑھوانے لے جایا جاتا اور ہم مسجد کی دیوار پھاند کر بھاگ جایا کرتے تھے۔
فیض صاحب اسی کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔
ایک روز حکیم احمد حسن کے صاحبزادے اوراپنے ہم عمر دوست محمود حسن کے ساتھ میں کالج آیا تو میں نے فیض صاحب کو ایک کلاس لیتے دیکھا۔
محمود نے کہا: ''تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''
حکیم احمد حسن امرتسر کی جانی پہچانی سیاسی شخصیت تھے اور اُن کا گھر ہمارے محلے میں ہی تھا۔ اُن کے گھر ہر ہفتے ادبی اجلاس ہوتے تھے۔ میں لکھتا تو کچھ بھی نہ تھا مگر ادب سے بڑا لگاؤ تھا اور محمود حسن کے گھر ان ادبی جلسوں میں کبھی کبھی ضرور شریک ہوتا تھا۔ اس روز بھی محمود حسن فیض صاحب کو آئندہ کے ادبی اجلاس کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ اُن کی نظم رکھی ہے۔ صدارت اختر حسین رائے پوری کی تھی جو اسی کالج میں لیکچرار تھے۔ میں اور محمود کالج کی گراؤنڈ میں سویٹ پیز کے پھولوں کے پاس بیٹھے باتیں کرنے لگے۔
محمود حسن کو ناک سے کھوں کھوں کرتے رہنے کی عادت تھی۔
وہ سویٹ پیز کے پاس بیٹھا بھی کھوں کھوں کیے جا رہا تھا۔
اتنے میں کلاس ختم ہو گئی۔ لڑکے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ ہم گراؤنڈ سے اُٹھ کر کلاس روم میں گئے۔ فیض صاحب بڑے خوبصورت سمر سوٹ میں تھے اور رجسٹر پر کچھ لکھ رہے

تھے۔ محمود حسن نے سلام کیا۔ میں نے بھی سلام کیا۔
اُنہوں نے ہمیں دیکھے بغیر آہستہ سے ناک سے کھوں کی آواز نکال کر کہا:
''ہاں بھئی۔''
بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ فیض صاحب بھی کبھی کبھی ناک سے کھوں کیا کرتے ہیں۔
محمود حسن اُنہیں آئندہ کے ادبی اجلاس کے بارے میں بتانے لگا اور میں فیض صاحب کا جائزہ لے رہا تھا، ایک عقیدت مند اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے۔ مجھے وہ بڑے دل کش لگے۔ ان کی آنکھیں اور بال بڑے خوبصورت تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں شعری گہرائی تھی اور بھاری بھاری سنجیدہ چہرے پر علم کی متانت اور وقار تھا۔
وہ قدیم ادب کی کوئی نادرِ روزگار شخصیت لگ رہے تھے۔
جس روز محمود حسن کے ہاں ادبی اجلاس تھا میں بھی وہاں موجود تھا۔ میرے علاوہ اور بھی کئی اصحاب تھے جن میں بابو غلام محمد بٹ، اقبال کوثر، خورشید شہزادہ، سیف الدین سیف، عارف عبدالمتین، احمد راہی اور شاید شہزاد احمد بھی تھے۔ اختر حسین رائے پوری صدارت کر رہے تھے۔ بیٹھک میں لوگ ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھے تھے۔ چھت کی کڑیوں پر اخبار کا کاغذ منڈھا تھا جس کے اندر کبھی کبھی کھڑ کھڑ کرتا ایک چوہا اِدھر سے اُدھر بھاگ جاتا تھا۔
کٹرہ کرم سنگھ کے ایک کشمیری لڑکے نے افسانہ پڑھا جسے پسند کیا گیا اور فیض صاحب نے اپنی تازہ غزل یا نظم سنائی۔ ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہے۔ بعض اشعار اُن سے بار بار سنے گئے اور فیض صاحب اپنے مخصوص رُکے رُکے، ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کبھی کبھی ناک سے کھوں کھوں کر کے شعر سناتے رہے۔
چھت والا چوہا جب بھی کھڑکھڑاتا ہوا شمال سے جنوب کی طرف بھاگتا تو محمود حسن بے قراری سے چھت کی طرف دیکھتا اور کھوں کھوں کرنے لگتا۔
''اس کا کوئی پکا انتظام کرنا پڑے گا۔''
امرتسر کے چوہوں کا بھی اپنا بڑا پکا انتظام تھا۔وہ بڑے وضع دار تھے۔ لاکھ جال بچھائیں وہ جس گھر میں ایک بار آ جاتے تھے پھر وہاں سے اُن کی لاش ہی باہر نکلتی تھی۔
اجلاس ختم ہو گیا۔ نمکین چائے اور باقر خانیاں آ گئیں۔ یہ امرتسر کے کشمیریوں کا خاص کلچر تھا۔ امرتسر کا کوئی کشمیری گھر ایسا نہ تھا جہاں سبز چائے نہ پکتی ہو اور کنستر میں باقر خانیاں

نہ رکھی ہوئی ہوں۔

فیض صاحب خاموشی سے پیالی میں باقر خانی ڈبو کر اُسے چمچ کی مدد سے کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باقر خانی کھانا بھی ایک فن ہے۔ ویسے میں دیکھ رہا تھا کہ فیض صاحب اس فن سے واقف ہیں۔ آخر ایک عرصہ سے وہ امرتسر میں پروفیسری کر رہے تھے۔ کیا ہوا جو وہ کشمیری نہیں تھے۔ امرتسر سے تو جو ہوا کا جھونکا بھی گزر جاتا تھا، گھر جا کر نمکین چائے اور باقر خانی کی فرمائش کرتا تھا۔

جس شئے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فیض صاحب کی خاموشی تھی۔ وہ بہت کم بات کرتے تھے۔ وہ آج بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔ آپ بولتے چلے جایئے وہ سنتے چلے جائیں گے اور سگریٹ پر سگریٹ پیتے چلے جائیں گے۔ بیچ میں کبھی کبھی ناک سے کھوں کر دیں گے یا ہوں کہہ دیں گے۔ اور بس اگر جواب دینا ضروری ہوا تو دو چار جملوں میں رُک رُک کر بات کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو بہت اچھا۔ اگر کامیاب نہ ہو سکے تو بھی سب اچھا ہے۔ وہ پھر چُپ ہو جائیں گے۔

امرتسر کے مشہور سیاسی لیڈر سیف الدین کچلو کا بیٹا محمود کچلو ہمارا دوست تھا۔ اُن کی کوٹھی مال روڈ کے آخیر میں بجلی گھر کے پاس تھی۔

محمود کچلو کے گھر بھی مہینے میں ایک بار ادبی اجلاس ہوا کرتے تھے۔ یہاں بھی امرتسر کے ادب دوست حضرات جمع ہوتے۔ فیض صاحب بھی اکثر آیا کرتے۔ محمود کچلو کی کوٹھی کے پچھواڑے آلوچے اور آڑو کے درخت تھے جن پر بہار کے موسم میں گلابی پھول آتے۔ مجھے یہ درخت بڑے پسند تھے۔ بلکہ اُن درختوں سے میں محبت کرتا تھا۔

خدا جانے آج اس کوٹھی میں کون رہتا ہے اور وہ درخت وہاں ہیں یا نہیں۔ بہرحال میں اُن درختوں کو آج بھی اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح یاد کرتا ہوں۔ ایک روز سنہری خوشگوار دھوپ کھلی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ درخت شگوفوں اور پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں اور محمود ایک پھولوں بھرے درخت کے پاس بانس کی سبز کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ میں نے اُسے کہا:

''یار کسی روز فیض صاحب کو اکیلے بلا کر اُن سے نظمیں سنی جائیں۔''

محمود کچلو کی عادت تھی کہ اپنے ایک کان کی لو کو اُنگلی سے مروڑتا رہتا تھا۔ پہلی بار دیکھنے پر ایسا لگتا تھا کہ کسی بات پر توبہ کر رہا ہے۔ میری اس خواہش کو اس نے خاموشی

سے سُنتا۔ پھر کان کی لو کو مروڑتا ہوا بولا:

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ میں ابا جی کی سفارش ڈلوا دوں گا۔''

''نہیں یار اُن کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے فیض صاحب بڑے پیارے شاعر ہیں۔ ہمارے کہنے پر ہی آ جائیں گے۔''

محمود نے کہا:

'' لیکن ہم اکیلے کیا کریں گے؟ کیا وہ ہم لڑکوں کی بات مان جائیں گے۔''

'' میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور مان جائیں گے۔''

'' تو پھر کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں، وقت کون سا ہوگا اور اُن کو کیا کھلایا پلایا جائے؟''

میں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا: ''ہائے کشمیریو! کھانے پینے کی فکر پہلے پڑ گئی ہے۔''

''ارے بھئی! اُن کو بھوکا تو نہیں رکھنا ناں۔ کچھ نہ کچھ تو سامنے رکھنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے دوپہر کے کھانے پر بلائیں کہ شام کے کھانے پر۔''

میں نے کہا: ''کھانے پر بلایا تو محفل کا رنگ دعوت کا سا ہو جائے گا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اُنہیں شام کی چائے پر بلا لیا جائے۔''

'' چلو یہ ٹھیک ہے۔''

بات طے ہو گئی۔ اب اگلے روز میں اور محمود کچلو ایم اے او کالج گئے تا کہ فیض صاحب کی منظوری حاصل کی جائے۔ فیض صاحب ابھی کالج نہیں آئے تھے۔

میں نے کہا: ''اُن کی کوٹھی چلتے ہیں۔''

فیض صاحب الیگزینڈر گراؤنڈ کے پاس ریالٹو سینما کے عقب میں رہتے تھے۔ یہ بھی بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ یہ کمپنی باغ کا ایک حصہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسی بہانے کمپنی باغ کی سیر بھی ہو جائے گی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے سامنے سے فیض صاحب کالج کے گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم نے آگے بڑھ کر اُنہیں سلام کیا۔ اُنہوں نے ہمیں دیکھے بغیر، بالکل سامنے سیدھ میں دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرا کر ہم سے ہاتھ ملایا۔

''کہو بھئی۔''

اس کے بعد فیض صاحب خاموش ہو گئے۔ ہم اُن کے ساتھ ساتھ چلتے اُن کے کمرے تک گئے۔ محمود کچلو نے اپنا مدعا بیان کیا۔ فیض صاحب سگریٹ سلگا کر خاموشی سے دھواں اُڑاتے اور سگریٹ کو اپنی انگلیوں میں گھماتے رہے۔ جب محمود نے بات ختم کر لی تو بھی

فیض صاحب خاموش رہے۔ پھر آہستہ آہستہ سے ناک میں سے ہُوں کی آواز نکالی اور سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''نظمیں تم یہاں مجھ سے سن لو بھئی۔''

میں نے جلدی سے کہا:

''فیض صاحب اصل میں بات یہ ہے کہ آلوچے کے درختوں کے پاس بیٹھ کر آپ کی نظمیں سُننا چاہتے ہیں۔''

فیض صاحب بہت بے معلوم انداز میں مسکرائے۔ اپنی خوبصورت آنکھیں ذرا سی گھما کر میری طرف ایک پل کیلئے دیکھا اور پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں۔'' آ جاؤں گا۔''

اُنہوں نے صرف اتنا کہا اور اپنے دفتری کام میں مصروف ہو گئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ محمود بولا: ''میں کل تیسرے پہر آپ کو لینے کوٹھی حاضر ہوں گا۔''

فیض صاحب نے آرام سے کہا: ''میں خود آ جاؤں گا۔''

ہم نے کسی دوست کو نہ بتایا کہ فیض صاحب کو چائے کی دعوت دے رکھی ہے۔ موسمِ بہار تھا۔ ہوا میں ان مختلف پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی جو کوٹھی کے پچھواڑے کیاریوں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے تھے۔ کبھی سویٹ پیز کی مہک آ جاتی، کبھی ہوا کی لہریں گیندے اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو اُڑاتے گزر جاتیں۔ گھاس کی سبز مہکار بھی تھی۔ آلوچے اور آڑو کے درخت تو پھولوں سے لدے ہوئے ہی تھے۔ اگرچہ ان پھولوں کی کوئی خاص خوشبو نہیں ہوتی لیکن اُن کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے خوشبو رنگ بن کر پھولوں سے لپٹ گئی ہے۔

ہم نے آلوچے کے درخت کے پاس میز کرسیاں بچھا دیں۔

چائے ہم نے خاص طور پر امرتسر چھاؤنی کی فوجی کینٹین سے منگوائی تھی۔ وہاں ولایتی چائے مل جایا کرتی تھی۔ مجھے نام یاد نہیں آ رہا کہ کون سی چائے تھی۔

ٹھیک چار بجے ہم کوٹھی سے کچھ دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد فیض صاحب کا تانگہ ہمارے قریب سے گزرا تو ہم لپک کر کوٹھی کے گیٹ پر آ گئے۔

فیض صاحب کا بڑی عقیدت کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

خوشی سے ہمارے چہرے لال ہو رہے تھے۔

اُنہوں نے صرف اتنا کہا: ''کیوں بھئی دیر تو نہیں ہوئی۔''

''جی نہیں، بالکل نہیں۔''

کوٹھی کے پچھواڑے آلوچے کے درختوں پر گلابی پھول ہی پھول دیکھ کر فیض صاحب نے ناک سے ذرا سی کھوں کی اور بانس کی آرام کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگے۔ چائے کے ساتھ کھانے کیلئے کچھ سینڈوچز وغیرہ بھی تھے۔ میں بار بار آلوچے کے درختوں اور پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض صاحب نے آتے ہوئے صرف ایک نظر ہی اُن پر ڈالی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے پھر آنکھ اُٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ سگریٹ پی رہے تھے اور سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی بیل کو دیکھ رہے تھے یا شاید اُسے بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

ہم نے چائے بنائی۔ چائے کا پہلا گھونٹ پینے کے بعد فیض صاحب نے ذرا کھنکارا۔ گلا صاف کیا۔ دوسری سگریٹ سلگائی اور پھر چائے پینے لگے۔ چائے پیتے وہ آنکھیں پوری کھول لیتے اور گھونٹ اندر نگلنے کے ساتھ ذرا سی بند کر لیتے۔ ہم بھی ادب کے مارے خاموش تھے اور فیض صاحب اپنی عادت کی وجہ سے خاموش تھے۔ بڑی خاموشی تھی۔

آدھی چائے پی کر فیض صاحب نے پیالی میز پر رکھ دی۔

ذرا سا کھنکارے۔ ناک سے تھوڑی سی کھوں کی آواز نکالی۔

ختم ہوتے سگریٹ کو پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور آہستہ سے بولے:

''ہاں بھئی۔''

اس کے بعد پھر خاموش ہو گئے اور سامنے والی دیوار کی بیل کو تکنا شروع کر دیا۔ پہلی بار باغ کی خاموشی کو ایک بُلبل نے توڑا۔ وہ ایک درخت سے اُڑتی ہوئی آئی اور ہمارے سروں کے اوپر سے غوطہ لگا کر آڑو کے ایک درخت پر پھولوں کے بیچ میں جا کر بیٹھ گئی۔

فیض صاحب نے اس بلبل کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ جب بلبل جا چکی تھی تب اُنہوں نے یونہی نگاہِ غلط انداز سے آسمان کو دیکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر باقی چائے کے گھونٹ نگلنے لگے۔ محمود کچلو نے کہا: ''سر! سینڈوچز اور لیجئے ناں۔''

فیض صاحب نے خالی ہاتھ کی انگلیاں اُٹھا کر کہا: '' اونہوں۔''

اب ہم سوچنے لگے کہ اُن سے کیسے کہیں کہ اپنی کوئی نظم سنائیں۔ وہ تو کوئی بات ہی نہیں کر رہے تھے نظم کہاں اور کیسے سنائیں گے؟ آخر یہ مرحلہ بھی محمود کچلو نے ہی طے کیا۔

فیض صاحب کی پیالی میں دوسری بات چائے اُنڈیلتے ہوئے بولا:

''سر! آپ کی وہ نظم ہمیں بہت پسند ہے جس میں یاسمین کے پھولوں کا ذکر ہے۔''

فیض صاحب کی کہنی آرام کرسی کے بازو پر ٹکی تھی۔ اُنہوں نے سگریٹ کے سر پر اُنگلی کی ہلکی سی ضرب مار کر راکھ جھاڑتے ہوئے کھنکار کر کہا۔ ''ہاں ... وہ ہے کہ ...''
اور پھر اُنہوں نے بڑی رومانٹک، دِھیمی، پرسکون اور پُر اثر انداز میں اپنی وہ نظم سنائی جس میں یہ مصرعہ آتا تھا ۔

یاسمین کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

مجھے یادنہیں آتا کہ وہ نظم کون سی تھی۔ ویسے اُن کے شروع کے دیوان ''نقش فریادی'' میں یہ نظم ضرور شامل ہوگی۔ اس کے بعد اُنہوں نے چند ایک اور نظمیں سنائیں۔
ان کے نظمیں سنانے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی پرسکون ندی جنگل میں پھولوں کے درمیان بڑے مترنم انداز کے ساتھ بہہ رہی ہو۔
پھر وہ اچانک اُٹھ کر بولے: ''اچھا بھئی اب چلیں۔''
یہ ہماری خوش قسمتی اور عزت افزائی تھی کہ فیض صاحب محض ہمارے کہنے پر وہاں آئے تھے اور اُنہوں نے ہمیں اپنی نظمیں بھی سنائی تھیں۔ ہم نے اُن کا بے حد شکریہ ادا کیا۔
وہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ تانگے میں بیٹھنے کے بعد اُنہوں نے کھنکار کر ہاتھ ذرا سا ہلا کر ہمیں الوداع کہا اور تانگہ روانہ ہوگیا۔ پھر اُنہوں نے ہماری طرف بالکل نہ دیکھا۔
خدا جانے چلتے تانگے میں وہ کدھر اور کہاں دیکھ رہے تھے۔
وقت گزرتا چلا گیا۔ زندگی کے انقلابات نے ہم سب کو کہیں سے کہیں لا کر پھینک دیا۔ اس کے بعد فیض صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات قیامِ پاکستان کے بعد ہوئی۔
میں افسانوں کی دُنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ انجمن کے ادبی جلسوں میں میں افسانہ پڑھتا تو فیض صاحب اجلاس میں ضرور موجود ہوتے۔ اُنہیں میرا اندازِ نگارش پسند تھا۔ شاید اسی لیے بھی کہ وہ خود بنیادی طور پر رومانٹک شاعر تھے۔
سویرا کی طرف سے ادیبوں اور شاعروں کو باغِ جناح میں چائے کی ایک پُرتکلف دعوت دی گئی تو دوسرے دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ فیض صاحب بھی تشریف لائے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ فیض صاحب کی خاموشی کو کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ باغِ جناح میں کافی لطیفے بازی ہوئی جس میں احمد راہی اور میں نے سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ فیض صاحب ہمارے لطیفوں سے بے حد لطف اندوز ہوئے۔ بلکہ حد یہ ہوئی کہ اُنہوں نے بھی ایک لطیفہ سنایا۔

ویسے فیض صاحب میں بہت زیادہ حسِ ظرافت تھی اور وہ اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بادۂ شبینہ کے ابتدائی لمحوں میں خوب چہکتے تھے لیکن اس کے بعد پھر ان پر خاموشی کا غلبہ طاری ہو جاتا اور جوں جوں رات آگے بڑھتی اُن کی خاموشی زیادہ بوجھل زیادہ روشن ہوتی چلی جاتی۔

اُن کی پہلی کتاب 'نقشِ فریادی' کی رسمِ افتتاح لاہور کے والگا ہوٹل میں ہوئی۔

پہلے اس ہوٹل کا نام ''ارجنٹینا'' تھا پھر ''والگا'' ہوگیا۔ یہ ہوٹل مال روڈ پر فیروز سنز کے بالکل سامنے تھا۔ آج کل وہاں ایک بلند و بالا عمارت کھڑی ہے۔

ہوٹل کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

اس زمانے میں فیض صاحب کی طرح یہ ہوٹل بڑا ٹھنڈا اور خاموش خاموش ہوا کرتا تھا۔ سیڑھیاں بالکل علی بابا چالیس چور کے غار کی طرح تھیں۔ اوپر جائیں تو دوسری منزل کے صحن میں رنگین پنجابی دیہات کے پیڑے اور لسی رڑکنے کی چاٹیاں رکھی تھیں۔

دیواروں پر عمر خیام کے اشعارتصویری شکل میں نقش تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔

شاذ و نادر ہی کوئی گاہک آ جاتا تھا اور اگر آ جاتا تھا تو پھر بیرا نہیں آتا تھا۔ اگر بیرا آ جاتا تو چائے نہیں آتی تھی۔

بہرحال فیض صاحب نے ہوٹل بھی خوب چُنا۔ رسمِ افتتاح کا انتظام پبلشر کی جانب سے ہوا تھا۔ شہر کے منتخب اصحاب جمع تھے۔ ہوٹل کی دوسری منزل بھری ہوئی تھی۔ بیرے اور در و دیوار حیرت سے تک رہے تھے کہ آج ہوٹل میں اتنی نفری کیسے آ گئی۔

وسط میں تپائی پر ''نقش فریادی'' کی جلدیں پڑی تھیں۔

فیض احمد فیض کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے گئے۔ دوست و احباب نے چھوٹی چھوٹی فی البدیہہ تقریریں بھی کیں۔ اس کے بعد فیض صاحب کے بولنے کی باری تھی۔

فیض صاحب ذرا سا کھنکارتے کھڑے ہو گئے۔ سگریٹ اُن کی انگلیوں میں سُلگ رہا تھا۔ خدا جانے وہاں موجود کس شے کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرائے اور فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔ پھر اُنہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں رُک رُک کر اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں بولنا شروع کیا۔ کچھ اپنے اشعار کی باتیں تھیں۔ کچھ اپنی باتیں تھیں۔ کچھ نظریات اور اُصولوں کی باتیں تھیں۔ کچھ امرتسر کے ایم اے او کالج کے زمانے کی باتیں تھیں۔ کچھ اپنی خاموشی و جاں سوزی کی باتیں تھیں۔ بیچ میں کئی بار گلا صاف کیا۔ باتیں بڑی برمحل اور بروقت تھیں۔

اس وقت کی سیاست کی باتیں بھی تھیں اور بین الاقوامی سیاست کاری کی باتیں بھی تھیں۔ بہرحال وہ تقریر بڑی خاموشی سے کر رہے تھے۔ بیچ میں کئی بار تقریر ختم کی اور پھر سے شروع کر دی۔ کئی بار ایسا لگا کہ فیض صاحب اب کچھ نہیں کہیں گے لیکن معلوم ہوا کہ ابھی انہیں مزید کچھ کہنا ہے۔

آخر ایک بار تقریر کرتے کرتے ایسے رُکے کہ بیٹھ گئے۔

تالیوں کی گونج میں وہ اپنی نشست پر مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگا رہے تھے اور گلا صاف کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان کی صاحبزادی سلیمہ نے جو کہ اُن دنوں بڑی پیاری اور بھولی بھالی بچی تھی، مہمانوں میں ''نقشِ فریادی'' کی کاپیاں تقسیم کیں۔

یہ سادہ اور پُر وقار تقریب چائے کی ضیافت پر ختم ہو گئی۔

صوفی تبسم نے ہوٹل والگا کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے فیض صاحب سے کہا:

''ذرا دائیں طرف مڑ جانا فیض۔''

دائیں طرف انگلش وائن والے تھے جو چڑیا گھر سے اُٹھ کر ''والگا'' کے زیرِ سایہ آ چکے تھے۔ فیض صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن سیڑھیاں اُتر کر اپنے آپ دائیں طرف مڑ گئے۔ پھر ہم لوگ پاک ٹی ہاؤس میں آ گئے۔

فیض صاحب سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُن کی مصروفیات ہم سے کافی مختلف اور دور دور بھی تھیں۔ کبھی کراچی کبھی انگلینڈ اور کبھی تہران میں ہوتے تھے۔

چراغ حسن حسرت صاحب کے بعد اُنہوں نے کچھ دیر ''امروز'' کی ادارت بھی کی۔ اُن دنوں فیض صاحب سے ''امروز'' کے دفتر میں اکثر ملاقات ہو جایا کرتی۔ پھر وہ پاکستان ٹائمز کے بھی ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اُن کا شعری مجموعہ ''دستِ صبا'' بھی شائع ہو چکا تھا۔

ان ہی دنوں ڈھاکہ میں ایک کل پاکستان ادبی اجلاس ہوا جس میں شرکت کیلئے دوسرے احباب کے ساتھ میں بھی ڈھاکہ گیا۔

ڈھاکہ میں اُن کا قیام اس وقت کے مشرقی پاکستان کے چیف سیکریٹری کے ہاں تھا اور ہم لوگ شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ابراہیم جلیس بھی تھا۔ اسی ہوٹل کے لاؤنج میں ہمارے ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ ہر اجلاس میں فیض صاحب سے ملاقات رہتی۔ یہاں بھی ایک اجلاس میں فیض صاحب کو تقریر کرنی پڑی اور وہ یہاں بھی اس مرحلے پر خاموشی سے گزر گئے۔ بڑی جامع، پُر مغز، مختصر اور خاموش تقریر تھی اُن کی۔

شام کو ہوٹل شاہ باغ کے کیفے ٹیریا میں فیض صاحب نے ہمیں کافی پلائی۔ میں تھا، ابراہیم جلیس تھا، ابنِ انشاء اور شوکت صدیقی بھی تھا۔ دُنیا جہان کے لٹریچر پر ہماری گفتگو ہوئی۔ بڑی بحث ہوئی ہم سب کی۔ فیض صاحب اتنا کرتے کہ ہم میں سے اگر کوئی جوش جذبات میں پٹڑی سے اُتر جاتا تو وہ ذرا سا کھنکار کر اُسے پھر پٹڑی پر سوار کر دیتے۔

شوکت صدیقی بار بار پٹڑی سے اُتر جاتا تھا۔

ابنِ انشا نے تنگ آ کر کہا: ''فیض صاحب! اس کو سائیڈ ٹریک پر ہی چلنے دیں۔''

فیض صاحب نے ذرا سا کھنکار کر ذرا سا مسکرا کر کہا: ''نہیں بھئی۔''

ڈھاکہ میں رمنا کے خوبصورت علاقے میں ایک جگہ کے رس گلے بڑے مزیدار اور مشہور تھے۔ ابنِ انشا نے اپنی عادت کے مطابق فیض صاحب سے کہا۔

''فیض صاحب آپ کو معلوم ہے رمنا میں ایک دکان پر رسگلے بڑے مزیدار ملتے ہیں۔''

'' تو پھر چل کر ہمیں کھلاؤ کمینے۔'' میں نے کہا۔

ابنِ انشا گردن ہلاتے ہوئے بولا: '' خیر اتنے مزے دار بھی نہیں ہوتے۔''

فیض صاحب نے آہستہ سے سگریٹ کا کش لگا کر کہا: ''چلو بھئی دیکھ لیتے ہیں۔''

''یہ بات ہوئی ناں۔'' ابنِ انشا نے جھٹ تائید کر دی۔

ابنِ انشا کی رہنمائی میں ہم رمنا کی رس گلوں والی دکان پر پہنچ گئے۔ بڑے ٹھاٹھ سے وہاں بیٹھ کر رس گلے کھائے۔ ظاہر ہے سارا بل فیض صاحب نے ادا کیا۔

ویسے فیض صاحب کو روپوں پیسوں کا حساب بالکل نہیں آتا۔ وہ صرف خرچ کرنا جانتے ہیں اور اپنے دوست احباب پر بے حساب خرچ کرتے ہیں۔ وہ جس قدر خرچ کرتے ہیں غیب سے اس سے بھی زیادہ آ جاتا ہے۔ رس گلے کھا کر نکلے تو ابنِ انشا بولا :

'' اس کے بعد اگر کافی نہ پی جائے تو رس گلے ہضم نہیں ہوتے۔''

ابراہیم جلیس نے پوچھا: ''اور وہ کافی کہاں سے ملے گی کمینے؟''

'' نیو مارکیٹ کے کافی ہاؤس میں۔''

اور ہم گاڑی میں بیٹھ کر نیو مارکیٹ آ گئے۔

یہاں پہلے ہی سے مغربی پاکستان کے ادیبوں کی ایک ٹولی محفل جمائے بیٹھی تھی۔ طفیل احمد جمالی خوب لطیفہ بازی کر رہے تھے۔ جمیل الدین عالی سر کھجاتے ہوئے بل کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ ویسے عالی اگرچہ انکم ٹیکس سے وابستہ تھے مگر حساب کتاب کے

معاملے میں وہ بھی فیض صاحب سے کم نہیں۔ جہاں دس خرچ کرنے ہوں گے وہاں پچاس خرچ کر دیں گے۔ ہاں بل اگر آ جائے اس پر غور و فکر ضرور کریں گے۔ بل خواہ دس روپے کا ہو یا دس ہزار کا۔

نیو مارکیٹ کے کافی ہاؤس کی فضا بہت ادبی قسم کی تھی۔ آج ڈھاکہ کے ناریل کے درختوں اور رمنا کے حسین باغات کے ساتھ ساتھ نیو مارکیٹ کی کافی بھی بہت یاد آتی ہے۔

ہم دیر تک اس کافی ہاؤس میں بیٹھے رہے۔ وہاں سے اُٹھے تو فیض صاحب نے ہمیں شاہ باغ میں ڈراپ کیا اور خود اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ڈھاکہ سے چٹاگانگ بھی جانا تھا۔ چٹاگانگ ڈھاکہ کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا اور پُر فضا شہر تھا۔ بندر گاہ بھی تھی۔ یہاں ہمارا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ ہمیں صرف دو روز یہاں ٹھہرنا تھا۔ دو اجلاس منعقد ہونا تھے۔ ایک اجلاس میں میری کہانی بھی تھی۔ یہ کہانی میں لاہور سے لکھ کر ساتھ لے گیا تھا۔

ابنِ انشا نے اعلان کر دیا:

''اس کہانی کو پہلے غور سے پڑھ لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نے پہلے بھی سُن رکھی ہو۔''

ابنِ انشا اس سے آگے بھی کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے لپک کر اُس کی گردن کو پکڑ لیا۔ ہم ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے تھے۔ فیض صاحب بھی وہاں آ گئے۔ مجھے ابنِ انشا کی گردن پر سوار دیکھا۔ مسکرا کر پوچھنے لگے: ''کیوں بھئی کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے کہا: ''ذرا اس کی گردن کی مالش کر رہا تھا۔''

ابنِ انشا نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''سچ کہنے پر تو لوگوں کی گردنیں بھی کٹ جاتی رہی ہیں۔ میری گردن کی تو اے حمید نے صرف مالش ہی کی ہے۔''

''بات کیا تھی بھئی؟''

میں نے ابنِ انشا کی گردن دوبارہ دبوچنے کی کوشش کی تو وہ بھاگ نکلا۔

ابراہیم جلیس نے کہا: '' اب اس کو جانے دو اے حمید۔''

فیض صاحب بانس کی کرسی پر بیٹھے سگریٹ سلگا رہے تھے۔

ہم ان کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ مشرقی پاکستان کے جنگلوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

ابراہیم جلیس نے کہا:

''سُنا ہے فیض صاحب یہاں کے شیر جنگلوں سے نکل کر شہروں میں بھی آ جاتے ہیں۔''

ابنِ انشا بولا: ''پہلے آیا کرتے تھے لیکن جب سے ہم لوگ لاہور سے یہاں آئے ہیں، وہ نہیں آتے۔''

اتفاق سے چٹا گانگ کے ایک شکاری بھی وہاں آ گئے۔ اُنہوں نے ہمیں سُندربن کے شیروں کے بارے میں عجیب دہشت ناک کہانیاں سُنانا شروع کر دیں۔

ابراہیم جلیس مبالغہ کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ فیض صاحب اس کی عادت سے پوری طرح باخبر تھے۔ اُنہوں نے مزاح کے موڈ میں مسکراتے ہوئے کہا:

''بھئی جلیس! دکن میں تم نے بھی تو ایک شیر مارا تھا۔''

جلیس کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ابنِ انشا بولا: ''کمینے ہنستے کیوں ہو۔ کوئی مزاحیہ شیر مارا تھا تم نے؟ آخر تم بھی تو شیر کے نامور شکاری ہو۔''

ابنِ انشا نے بات کو آگے بڑھایا۔ فیض صاحب نے کہا:

''ہاں بھئی تمہارے قصے تو ہم نے بھی سنے ہیں۔''

اب ابراہیم جلیس سمجھ گیا کہ اس سے شیر کے شکاری کا پارٹ ادا کرنے کی توقع کی جا رہی ہے۔ پس اس کی رگِ مبالغہ حرکت میں آ گئی۔ اس نے جو شیروں کے شکار کے بھیانک قصے شروع کئے تو چٹا گانگ کے شکاری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

لیکن آخر ابراہیم جلیس، ابراہیم جلیس تھا۔ اس کے پاؤں نہیں تھے۔

ایک شیر کے شکار کی کہانی بیان کرتے کرتے ایسا ٹھوکر کھا کر گرا کہ وہ اصلی شکاری فوراً سمجھ گیا کہ اس سے مذاق کیا جا رہا ہے۔

اس کا تو منہ بن گیا۔ کیونکہ جیسا بھی تھا، وہ تھا تو اصلی شکاری۔

یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا: ''آپ لوگ مذاق کے موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔''

اس کے جاتے ہی جلیس اس قدر کھلکھلا کر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

ابنِ انشا نے کہا: ''سالے جھوٹ میں کبھی تو سچ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کیا کرو۔''

''کیا کروں میں تو سچ اس طرح بولتا ہوں کہ لوگوں کو جھوٹ کا شبہ ہوتا ہے۔''

فیض صاحب نے کہا: ''بھئی تم نے ہمارے اصلی شکاری کو بھگا دیا۔''

جلیس بولا: ''میں تو شیر کو بھی اس طرح بھگا دیا کرتا ہوں۔''

دوسرے روز اجلاس شہر کے ایک خوبصورت ہوٹل کے لاؤنج میں ہوا۔ میں نے کہانی

پڑھی۔ کہانی نئی تھی۔ ابنِ انشا ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ مگر میں اس کے ہاتھ نہ آیا۔ پڑھتے پڑھتے میں بیچ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ کہانی ختم کر کے میں اسٹیج سے اُتر کر اپنی سیٹ پر آیا تو جلیس نے کہا: ''یہ تم نے نئی کہانی کیسے لکھ لی؟''

ابنِ انشا نے جھٹ لقمہ دیا: ''کسی نے لکھ کر دے دی ہوگی۔''

فیض صاحب اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ مقالہ چٹاگانگ کے ایک صاحب کا تھا۔ بڑا پُرمغز مقالہ تھا۔ جب تک وہ مقالہ پڑھتے رہے لوگ اپنا سر کھجاتے رہے۔ بڑا ہی پُرمغز مقالہ تھا۔ اس دوران فیض صاحب بڑے عیش میں رہے۔ ساری محفل میں صرف وہی ایک فردِ واحد تھے جو مقالہ نہیں سُن رہے تھے۔ یعنی یہ فیض صاحب کو کمال حاصل تھا کہ وہ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ سُنتے ہوئے بھی نہیں سنتے تھے اور بیٹھے ہوئے بھی نہیں بیٹھے ہوتے تھے۔ اپنے اس کمال کا وہ اس محفل میں پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے مقالہ ختم ہوا۔ فیض صاحب کو پتہ ہی نہ چلا کہ مقالہ ختم ہوگیا ہے۔ سُن رہے ہوتے تو پتہ بھی چلتا۔ جب مقالہ نگار اسٹیج سے اُتر گئے تو فیض صاحب نے دیکھنا اور سُننا شروع کیا۔ اب اُنہیں معلوم ہوا کہ مقالہ ختم ہوگیا ہے کیونکہ مقالہ نگار اسٹیج پر موجود نہ تھا۔ ظاہر ہے مقالہ ختم ہوا ہی ہوگا تو وہ چلے گئے تھے۔

فیض صاحب نے اگلے پروگرام کا اعلان کیا۔

اب ایک منحنی سے شاعر بنگالی زبان میں اپنی طویل نظم سنانے اسٹیج پر تشریف لائے۔

اور فیض صاحب پھر غائب ہوگئے۔

لاہور میں خدا غریقِ رحمت کرے، عابد علی عابد صاحب بھی یگانہ روزگار بلکہ نابغۂ روزگار تھے۔ نکلسن روڈ پر اُن کی قیام گاہ پر ادبی نشستیں جمتی تھیں تو فیض صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ عابد صاحب کے دم سے لاہور کی علمی ادبی زندگی میں بڑی رونقیں رہیں۔ دیال سنگھ کالج میں بڑا شاندار ڈنر ہوتا، جس میں فیض، تاثیر کے علاوہ شہر کے چوٹی کے بزرگ ادبا، شعرا اور نقاد حضرات شرکت کرتے اور ایسی ایسی شگفتہ باتیں ہوتیں کہ آج خیال آتا ہے کہ اُنہیں ریکارڈ کر لیا جاتا تو وہ علم و ادب کا ایک انمول ذخیرہ ہوتیں۔

فیض صاحب ان مجلسوں میں بھی کم سخنی سے کام لیتے تھے لیکن ان کے تازہ اشعار اُن کی اپنی زبان سے سُننے کا نادر موقع ضرور مل جاتا تھا اور یہی بات بڑی غنیمت تھی۔ ویسے اُن کی شفقت اور خلوص بھری محبت تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوا کرتی۔ کبھی کسی کو نہیں

ٹالتے۔جس کسی نے جا کر کوئی کام کہا اگر کر سکتے ہیں تو کر دیتے ہیں۔ سب کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ ایک دل کش دھیمی سی مسکراہٹ ہر وقت اُن کے چہرے پر رہتی اور آج بھی رہتی ہے۔ خدا اُنہیں عمرِ خضر عطا کرے۔

لاہور کے فلیٹیز میں اُن کی شاید ساٹھویں سالگرہ کی تقریب ہوئی تو مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ فیض صاحب سے ملاقات کا بہانہ تو ملا۔ مجھے ہمیشہ ان سے مل کر یہی محسوس ہوتا کہ جیسے میں قدیم شعروں کی کوئی خوبصورت کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اُن کی نیم تخنی اور کم آمیزی میں بھی ایک شعری حسن ہے۔

فلیٹیز کے ہال میں فیض صاحب نے مجھے گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی ...''

اُن کے کوٹ کے کالر سے بڑی ہلکی ہلکی برٹش سینٹ کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

وہاں میرے کافی دوست جمع تھے۔ سب سے باری باری ملاقات ہوئی۔ اس تقریب میں انور علی نے فیض صاحب پر بڑا دلچسپ مضمون پڑھا۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے انور کو فیض صاحب کے تمام پہلوؤں کو دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ ویسے میرے خیال میں فیض صاحب اگرچہ پہلو دار شخصیت رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کا ہر پہلو دوسرے پہلو جیسا ہی ہے۔ مثلاً اگر محفل میں وہ آپ کو ایک خاص انداز میں سگریٹ پیتے نظر آتے ہیں تو تنہائی اور اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بھی وہ اسی انداز میں سگریٹ پیتے ہیں۔ اگر محفل میں وہ زیادہ وقت خاموش رہتے ہیں تو یقین کریں تنہائی میں بھی وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہتے ہیں۔

میں اور صفدر میر میز کے پاس کھڑے چائے پی رہے تھے۔

صفدر میر نے میری ایک بات زور سے قہقہہ لگایا۔ حالانکہ میں نے اس کو ایک ایسی بات بتائی تھی جس پر اُسے اداس ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر صفدر میر نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ کئی لوگوں کی گردنیں ہماری طرف مڑ گئیں۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے صفدر میر سے کیا بات کی تھی۔ لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ بھی قہقہہ نہیں لگائیں گے۔ میں نے اُسے ایک خوش لباس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ

'' دیکھو یہ جو لڑکی ہے ناں ... یہ ... اچھا چلیں جانے دیں۔ پھر کبھی بتاؤں گا۔''

فیض صاحب نے آخر میں اپنے بارے میں کچھ باتیں کی اور کچھ غزلیں اور نظمیں سنائیں اور یوں محفل برخاست ہوگئی۔ اور فیض صاحب صوفی صاحب کے ساتھ چلے گئے۔

فیض صاحب کے چھوٹے بھائی میجر عنایت میرے دوست ہیں۔
میجر عنایت کے ساتھ بہاول پور کی نیلی ریگستانی راتوں اور کوہ مری کی برفباریوں کی بڑی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ اُن سے مل کر فیض صاحب کی بہت یاد آتی ہے۔
پچھلی بار وہ مجھے ملے تو اپنے لان میں کرسی پر بیٹھے ٹامس ہارڈی کا ناول پڑھ رہے تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے ...
اُنگلی کی ہلکی ضرب سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور کہا:
''آؤ بھئی ...''
اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئے۔

☆☆☆☆☆